© rasailojaraid.com

تحقیق وتنقید

پروفیسر محمد دین قاسمی

قرآن فہمی اور حدیث نبوی ﷺ

'طلوعِ اسلام' کے 'اشراق' اور 'محدث' کی تنقید میں لکھے گئے مباحث کا جائزہ

جناب غلام احمد پرویز بلا شبہ ذہین آدمی تھے۔ ذہانت و فطانت کے ساتھ عمدہ قلمی صلاحیتوں کے بھی حامل تھے۔ جدید افکار و نظریات سے متاثر ہی نہیں بلکہ انتہائی مرعوب بھی تھے۔ اسی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کے باعث وہ قرآن مجید سے نت نئی چیزیں کشید کیا کرتے تھے، جو ان کے پیروکاروں کے نزدیک 'علمی جواہر پارے' اور ان کے مخالفین کی نظر میں 'تحریفات و تلبیسات' تھیں۔ تاہم وہ غور و فکر، سوچ بچار اور فکر و تدبر سے کام لینے والے تھے، لہٰذا فضاے دماغی میں اُٹھنے والی ہر لہر کے ساتھ ان کے آراء و نظریات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی تھی، جس کے نتیجے میں طلوعِ اسلام کی فائل از ابتدا تا انتہا ایک وسیع خارزارِ تضادات و تناقضات کا منظر پیش کرتی ہے۔ لیکن اپنے ان تضادات پر پردہ ڈالے رکھنے کے لئے وہ مجبور تھے کہ خوردبینی مطالعہ کے ذریعہ اپنے مخالفین کی تحریروں میں سے تضادات کو 'دریافت کرکے' خوب اُچھالا جائے اور نہ ملنے کی صورت میں اپنی ذہانت و فطانت کو کام میں لاتے ہوئے اُنہیں 'پیدا کرکے' یہ ڈھنڈورا پیٹا جائے کہ

> "مفاد پرستوں کے خود ساختہ اسلام کے کئی مختلف ایڈیشن شائع ہوئے لیکن مصلحت اندیشیوں کی دیمک نے اُنہیں اس طرح چاٹا کہ ان کا ایک حرف بھی زمانہ کے صفحہ پر دکھائی نہیں دیتا، لیکن تغیرات کی ان آندھیوں میں اور انقلابات کے ان جھکڑوں میں ایک طلوعِ اسلام ہے کہ جس میں آپ کو نہ کہیں تضاد ملے گا، نہ تخالف نظر آئے گا۔"[①]

لیکن پرویز صاحب کے فکری پسماندگان جو طلوعِ اسلام کی اشاعت کا بیڑا اب تک اُٹھائے ہوئے ہیں، وہ نہ تو ذہانت و فطانت کے اعتبار سے اور نہ ہی قلمی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کے موزوں وارث بن پائے۔ وہ نہ تو پرویز صاحب کی سی خوردبینی نظر رکھتے ہیں کہ

(۲۸) طلوع اسلام، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲۳ تا ۲۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے مخالفین کے عیوب و اسقام کو ڈھونڈ پائیں اور نہ ہی ایسی ذہنی چابک دستی رکھتے ہیں کہ اپنے مخالفین میں خامیوں کو 'پیدا کرکے' ویسا پراپیگنڈا کرسکیں اور یوں طلوعِ اسلام کی گاڑی رواں دواں رہے۔ اس لئے وہ بے چارے مجبور ہیں کہ پرویز صاحب ہی کے 'علمی جواہر پاروں' پر گزارہ کرتے رہیں اور اُنہیں کے گھسے پٹے نظریات کو اعادہ وتکرار کے ساتھ طلوعِ اسلام میں پیش کرتے رہیں۔ اگر کہیں نقد و تبصرہ کا شوق سر اُٹھائے تو دس پندرہ سال پہلے کے کسی رسالے میں شائع ہونے والے کسی مضمون و مقالہ کو اپنی طبع آزمائی کا نشانہ بنایا جائے۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام کی قریبی اشاعتوں میں شائع ہونے والے مباحث اسی نظریۂ ضرورت کے شاخسانے ہیں۔ ان مباحث کی ابتدا جناب ابومنیب راشد صاحب کے اس مقالہ سے ہوئی ہے جو ستمبر ۱۹۹۰ء کے 'اشراق' میں چھپنے والے مضمون کی تردید میں لکھا گیا ہے حالانکہ برسوں پہلے جناب خورشید احمد ندیم صاحب کے ہاتھوں گڑے ہوئے مُردوں کو اکھاڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن بہرحال طلوعِ اسلام کا پیٹ بھی تو بھرنا تھا۔

سردست، جناب ابومنیب راشد صاحب کے مقالہ پر تفصیلی نقد و تبصرہ کرنا میرے پیش نظر نہیں ہے۔ چند ایک باتوں پر اجمالاً اظہارِ خیال کرنے کے بعد میں آئندہ قسط میں 'قرآن فہمی اور حدیثِ نبویؐ' کے زیرعنوان اس مقالہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو طلوعِ اسلام مئی ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس لئے یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ابومنیب راشد صاحب اور دوسرے میں جناب خواجہ ازہر عباس صاحب کی نگارشات پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

حصہ اوّل

❶ جناب مضمون نگار کا تحدی آمیز مطالبہ

مضمون نگار صاحب ایک مقام پر بڑے تحدی آمیز انداز میں جناب خورشید احمد ندیم صاحب سے مستفسر ہیں کہ کیا وہ اس امر کو ثابت کرسکتے ہیں کہ پورے قرآن میں کسی ایک اسم علم کو پرویز صاحب نے اسم نکرہ بنا دیا ہو؟ یا کسی بھی اسم نکرہ کو اسم علم ٹھہرا دیا ہو۔ جہاں تک ہم نے پرویز صاحب کو سنا اور پڑھا ہے، ہمیں تو کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ اگر ندیم صاحب کو پرویز صاحب کے ہاں کوئی ایک بھی ایسی بے ہودہ ولایعنی مثال ملی ہو تو وہ ہمارے سامنے پیش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریں۔④

مثالیں تو بہت سی ہیں لیکن ایسے لوگوں کو یہ مثالیں کبھی نظر نہیں آیا کرتیں جو حقیقت کی آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے عقیدت کی عینک میں سے دیکھنے کے عادی ہوں یا اپنی اندھی عقیدت وارادت کا تقاضا یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی نمایاں مثالوں سے صرفِ نظر ہی کرلیا جائے تاکہ عقیدت کے نازک آبگینوں کوٹھیس نہ لگ جائے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ع

آنکھیں اگر ہوں بند، تو پھر دن بھی رات ہے   اس میں بھلا قصور کیا ہے آفتاب کا!!

میں ایک مثال صرف اس لئے پیش کررہا ہوں کہ اوّلاً تو اس مقالہ میں زیادہ مثالوں کی گنجائش نہیں اور ثانیاً مطالبہ بھی صرف ایک ہی مثال کا ہے۔ ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جس طرح زید، خالد، سلیم، اسم معرفہ ہیں اُسی طرح نوحؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ کی طرح آدمؑ بھی اسم معرفہ ہیں۔ لیکن ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب، آدمؑ کو (جو اسم علم ہونے کی بنا پر ہی اسم معرفہ ہے) بطور اسم نکرہ ہی کے پیش کرتے رہے ہیں۔ آدم، بہرحال فردِ خاص تھا، بالکل اسی طرح جس طرح نوحؑ، ابراہیمؑ، اور عمران نام کے مذکور فی القرآن لوگ خاص افراد (اسم معرفہ) تھے لیکن ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب حضرت آدم علیہ السلام کو اسم علمؑ، اسم معرفہ یا فرد خاص قرار دینے کی بجائے یہ کہا کرتے تھے کہ

''آدم سے مراد آدمی ہے، قصہ آدم خود آدمی کی سرگزشت ہے نہ کہ کسی خاص فرد کی داستان!''③

اب یہ فیصلہ کرنا طلوعِ اسلام یا جناب مضمون نگار صاحب کا اپنا کام ہے کہ آدمؑ جیسے اسم علم اور اسم معرفہ کو اسم نکرہ بنا ڈالنے کی یہ پرویزی مثال بے ہودہ و لایعنی مثال ہے یا نہیں۔

❷ عابد بمعنی حریص و لالچی؟

ستمبر ۱۹۹۰ء کے 'اشراق' میں چھپنے والے ایک مقالہ میں جناب خورشید احمد ندیم صاحب نے ایک عربی لفظ عابد کا معنی 'حریص اور لالچی' شخص بھی بیان کیا تھا۔ اس پر جناب مضمون نگار صاحب بڑے تعلّی آمیز انداز میں اپنے پندارِ علم کا مظاہرہ بایں الفاظ کرتے ہیں۔

''خدا معلوم کہ جناب ندیم صاحب کے پاس کون سا اُردو لغت ہے کہ جس میں عابد کا معنی حریص و لالچی لکھا ہے، اگر ایسا کوئی لغت ہے تو وہ اس کا حوالہ دے کر اور اس کے پبلشرز کا

② طلوع اسلام، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۱۳   ③ ابلیس و آدم، ص ۴۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اَتہ پتہ بتا کر ہمارے لئے جود و کرم کا باب وا کرنے میں بخل و تساہل سے کام نہیں لیں گے۔ ایسا مطالبہ کرنا بالکل بجا اور درست ہے، کیونکہ آپ نے محولہ بالا عبارت میں اعتراف کیا ہے کہ لغت کے لحاظ سے یہ صحیح مفہوم ہے جب لغات کے حوالے سے یہ صحیح ہے تو پھر لغات ہی سے سند کا مطالبہ کرنا بھی صحیح اور معقول ہے۔''④

اب جناب مضمون نگار صاحب کو یہ کون سمجھائے کہ 'عابد' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اُردو زبان میں بھی یہ لفظ عربی زبان ہی سے آیا ہے۔ لہٰذا اس معنی کی تلاش اگر پیش نظر ہے تو اُردو لغات کی بجائے عربی لغات کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اگر وہاں بھی یہ معنی نہ ملے تو بھی جناب مضمون نگار صاحب کے لئے ایسا تعلّی آمیز پندارِ علم کا مظاہرہ کرنا ایک حد تک جائز ہوگا اگرچہ اخلاقاً یہ کوئی مستحسن چیز نہیں ہے۔ میں تفصیل و اطناب سے گریز کرتے ہوئے صرف دو کتب لغت کا حوالہ پیش کررہا ہوں، جس میں یہ معنی موجود ہے۔ عبد عليه : حرص⑤

اب میں ایک ایسی کتاب لغت کا حوالہ پیش کررہا ہوں جس تک رسائی پانا معمولی پڑھے لکھے انسان کے لئے بھی آسان ہے۔ عبد على الشيئ حریص ہونا، صفت عابد وعبد⑥

جہاں تک ان کتابوں کے 'پبلشر کا اتہ پتہ بتانے' کا تعلق ہے تو اوّل الذکر کتاب المعجم الوسیط تہران ایران سے انتشارات ناصر خسرو کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے جبکہ ثانی الذکر 'مصباح اللغات' عربی اردو لغت ہے جس کا مؤلف عبدالحفیظ بلیاوی ہے اور اسے ایچ ایم سعید کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

فی الحال، طوالتِ مقالہ سے بچتے ہوئے انہی دو حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ دیگر کتب لغات سے بھی اس معنی کی تصدیق ممکن ہے۔

③ مضمون نگار کا ایک اور تعلّی آمیز مطالبہ

جناب مضمون نگار صاحب نے ایک اور تحدی آمیز مطالبہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''لغات سے سند طلب کرنے کے علاوہ ہمارا دوسرا مطالبہ ان سے یہ ہے کہ وہ (یعنی ندیم صاحب) جناب پرویز صاحب کے مضامین و مقالات اور معارف و مطالب کے ہزاروں

---

④ طلوع اسلام، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۱۳ ⑤ المعجم الوسیط ج ۲، ص ۵۷۹، انتشارات ناصر خسرو، مہران، ایران

⑥ مصباح اللغات، ص ۵۲۷، سعید اینڈ کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صفحات پر پھیلے ہوئے ان جواہر پاروں میں سے کہ جنہیں اُردو میں ادبِ عالیہ کا مقام حاصل ہوچکا ہے، کوئی ایک لفظ ایسا دکھا دیں کہ جس کے ساتھ جناب پرویز صاحب نے وہی کچھ کیا ہو جو اُنہوں نے عابد کے لفظ کے ساتھ کیا ہے۔'' (٧)

مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ جناب مضمون نگار صاحب نے 'کوئی ایک لفظ' ہی دکھا دینے کا مطالبہ کیا ہے جبکہ میں خود مقالہ میں اختصار کا خواہاں ہوں۔ لیجئے ایک ایسا لفظ جس کے ساتھ واقعتاً پرویز صاحب نے وہی (بلکہ اس سے بھی بدتر) سلوک کیا ہے جس کا الزام وہ اپنے مخالف پر لگا رہے ہیں۔ یہ لفظ ہے بَغْيًا جو سورہ مریم میں دو جگہ آیا ہے۔

﴿قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾ (مریم:٢٠)

''(مریم نے) کہا میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جبکہ مجھے کسی فرد بشر نے چھوا تک نہیں اور نہ میں بدکار و بدچلن رہی ہوں۔''

﴿يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا﴾ (مریم:٢٨)

''اے اُختِ ہارون! نہ تیرا باپ ہی کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکردار و زناکارہ تھی (تو یہ کیا پاپ کر بیٹھی؟)''

ان آیات میں بغیًا کے لفظ کا ایک ہی معنی ہے: 'زناکار، بدچلن، بدکار' عربی زبان میں یہ لفظ اسی مفہوم کے لئے آتا ہے۔ 'مفکر قرآن' نے اس لفظ کو طلوعِ اسلام کے مَصنع میں خراد پر چڑھا کر اسے اپنے خودساختہ مفہوم میں ڈھالا ہے اور پھر یہ اعلان کیا کہ سورہ مریم میں بغیا کا لفظ حدود شکن کے لئے (١٩/٢٠) آیا ہے، خاص طور پر زناکار کے لئے نہیں۔ (٨)

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ زناکار کے علاوہ کسی اور معنی میں آتا ہی نہیں ہے۔ اگر اس کا معنی تکلف، تصنع اور بناوٹ کے ساتھ 'حدود شکن' کیا جائے (بشرطیکہ ایسا کرنا محال نہ ہو) تو یہ حدود شکنی بھی عفت و عصمت کے حوالہ ہی سے ہوگی، (نہ کہ مطلق حدود شکنی)۔ 'مفکرِ قرآن' نے لفظ بغیًا کے ساتھ، یہ سلوک صرف اس لئے کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ ولادت کو نہ ماننا پڑے۔ چودہ صدیوں میں منکرین حدیث کے گروہ کے علاوہ کسی مفسر قرآن اور مترجم قرآن عالم دین نے اس لفظ کا معنی 'حدود شکن' بیان نہیں کیا۔ ہر ایک نے 'بدکار

(٧) طلوع اسلام، فروری ٢٠٠٥ء، ص ١٣ (٨) لغات القرآن (پرویز) ص ٣٣٦

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وزناکار یا بدچلن' ہی اس کا معنی لکھا ہے۔ حتیٰ کہ خود پرویز صاحب نے بھی اپنے ماضی میں (جبکہ وہ روشنی سے تاریکیوں کی طرف اپنے سفر کی ابتدائی منازل میں تھے) یہی 'زناکار وبدچلن' کا معنی درج کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، متذکرہ بالا آیات کے پرویزی تراجم:

> ''مریم بولی! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں، اور نہ میں بدچلن ہوں۔ (9) اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکردار تھی (تو یہ کیا کر بیٹھی؟)'' (10)

خدا معلوم کہ جناب مضمون نگار صاحب کے پاس (پرویزی لغات کے سوا) کون سا لغات ہے جس میں بغیًا کا معنی 'حدود شکن' لکھا ہوا ہے۔ اگر ایسا کوئی لغت ہے تو وہ اس کا حوالہ دے کر اور اس کے پبلشر کا اتہ پتہ بتا کر ہمارے لئے جود وکرم کا باب وا کرنے میں بخل وتساہل سے کام نہ لیں۔

اپنے اُصول کی آپ مخالفت

جناب مضمون نگار صاحب سے گزارش ہے کہ وہ 'فکرِ پرویز کی اصل قدر وقیمت' کے صحیح تعین کے لئے اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ 'مفکرِ قرآن' صاحب اپنی تفسیری کارگزاریوں کے دوران خود اپنے تسلیم شدہ اصولوں کی بڑے دھڑلے سے مخالفت کیا کرتے تھے، مثلاً وہ یہ اُصول بیان کیا کرتے تھے کہ

> ''جب کوئی لفظ اصطلاح کی شکل میں مستعمل ہونے لگ جائے تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے۔ اس کے بعد آپ جب بھی اس لفظ کا استعمال کریں گے وہ اپنے اُن تمام مضمرات ولزومات کو اپنے ساتھ لائے گا جن سے وہ نظریہ یا نظام عبارت ہے، جس کے لئے وہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔'' (11)

اُصول آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اس کے بعد خود 'مفکرِ قرآن' ہی کے قلم سے یہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے کہ قرآن میں کون کون سے الفاظ بطورِ اصطلاح مستعمل ہیں:

> ''قرآنِ کریم میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کی اصطلاحات دین کے بنیادی ارکان (عمائد اور ستون) کی حیثیت سے بار بار دہرائی جاتی ہیں۔'' (12)

(9) معارف القرآن، ج ۳ ص ۹۲، ۲۹۳، ۵۵۱، ۵۵۱ (10) ایضاً ج ۳ ص ۵۵۲ (11) طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۷۳ء ص ۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس اقتباس سے واضح ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ قرآنی اصطلاحات ہیں۔ ایک اور مقام پر انفاق کو بھی اصطلاحِ قرآن کہا گیا ہے:

''انفاق کے معنی خرچ کرنے کے نہیں بلکہ یہ ایک ایسی روش، نظریہ یا معاشی نظام کی اصطلاح ہے جس میں سامانِ زیست کو روک کر نہیں رکھا جاتا بلکہ اسے عالمگیر ربوبیتِ انسانیہ کے لئے کھلا رکھا جاتا ہے۔''(۱۳)

ان دونوں اقتباسات سے اقامتِ صلوٰۃ، ایتاء الزکوٰۃ اور انفاق (تینوں) کا قرآنی اصطلاحات ہونا واضح ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ 'مفکر قرآن' کے نزدیک صرف یہ تین ہی قرآنی اصطلاحات ہیں، نہیں، بلکہ ان کے ہاں یہ فہرست بہت لمبی ہے لیکن ہم صرف ان تینوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

'مفکرِ قرآن' صاحب ان تینوں کو اسلام کی اصطلاحات بھی قرار دیتے ہیں، لیکن پھر ان کا مفہوم متعین کرنے کے لئے کتبِ لغات کھول کر بھی بیٹھ جاتے ہیں، چنانچہ اس اصطلاح کا مفہوم وہ ازروے لغت متعین کرتے ہیں اور شارع علیہ السلام کے اس مفہوم کو جو تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، قطعی نظر انداز کرتے ہیں اور لغوی موشگافیوں پر مبنی قلمی ورزش کے نتیجہ میں کئی پیراگراف اس کے لئے وقف کرڈالتے ہیں جن کو طوالت کے پیش نظر یہاں نقل نہیں کیا جارہا ہے۔ (دیکھئے 'لغات القرآن' از پرویز: ج۳/ص۱۰۳۴)

اسی طرح کا معاملہ وہ ایتاءِ زکوٰۃ کی اصطلاح کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایتاء کی الگ لغوی بحث کرتے ہیں اور زکوٰۃ کی الگ۔ پھر مؤخرالذکر لفظ کی بحث کے دوران وہ علماے لغت کے حوالے سے جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ ان کی قلمی چابک دستی کے باعث حقیقت سے بعید ہوتا ہے۔ لغات القرآن میں یہ بحث تقریباً دو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن حرام ہے جو اس اصطلاح میں کہیں ان مضمرات ولزومات کا بھی ذکر ہو جو خود شارع علیہ السلام نے اس میں سمو دیئے ہیں۔ اس بحث میں انحرافات کی قلعی، ماہنامہ محدث کے شمارہ مارچ ۱۹۸۹ء میں کھولی جاچکی ہے۔

یہی کھیل 'مفکرِ قرآن' نے انفاق کی اصطلاح کے ساتھ بھی کھیلا ہے اور وہ اس کے خود

(۱۲) تفسیر مطالب الفرقان، ج۱/ص۹۷ (۱۳) تفسیر مطالب الفرقان، ج۱/ص۱۰۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساختہ معنی 'کھلا رکھنا' پیش کرتے ہیں اور پھر سینہ زوری کا یہ عالم ہے کہ وہ یہ نہیں کہتے کہ انفاق کا معنی 'کھلا رکھنا' بھی ہے، تاکہ کسی دوسرے معنی (بلکہ اصل مفہوم) کی گنجائش بھی باقی رہ جائے، بلکہ وہ 'خرچ کرنے' کے معنی کی قطعی نفی کرتے ہیں اور 'کھلا رکھنے' کے واحد معنی کا اثبات کرتے ہیں۔ (جیسا کہ گذشتہ اقتباس میں گزر چکا ہے۔) مزید برآں وہ بہت سی قرآنی آیات میں اس معنی کو نبھا بھی نہیں سکے ہیں، پھر یہ اصطلاح جب ان کی لغوی تحقیق کی جولانگاہ سے نجات پاکر نکلتی ہے تو اس کا چہرہ انحرافات سے داغدار ہو چکا ہوتا ہے۔ ان انحرافات کا پردہ بھی اپریل ۱۹۸۹ء کے شمارہ محدث میں چاک کیا جاچکا ہے۔

لغوی 'تحقیق' کے لئے کتبِ لغات کو کھنگالنے کے ساتھ ساتھ 'مفکر قرآن' صاحب یہ ڈھنڈورا بھی پیٹتے نہیں تھکتے کہ

① ''ہر نظام کی ایک اصطلاح ہوتی ہے اور وہ اصطلاح اسی نظام کے منطوق کے اظہار کے لئے وضع کی جاتی ہے۔'' ⑭

② ''جب کوئی لفظ بطورِ اصطلاح کے رائج ہو جائے تو اس کے لغوی معانی نہیں بلکہ اصطلاحی معانی لئے جاتے ہیں۔'' ⑮

③ ''جب کوئی لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے، تو اس کے لغوی معنی نہیں لئے جاتے۔ اصطلاحی مفہوم لیا جاتا ہے اور ان میں اکثر بڑا فرق ہوتا ہے۔'' ⑯

'مفکرِ قرآن' کا (ہر معاملہ کی طرح) اس امر میں بھی متضاد طرزِ عمل ملاحظہ فرمایئے کہ وہ اقامت الصلوٰۃ، ایتاء الزکوٰۃ اور انفاق وغیرہ کو قرآنی اصطلاحات بھی مانتے تھے اور پھر یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ''جب کوئی لفظ اصطلاح کی شکل میں مستعمل ہونے لگ جائے تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے۔'' ...... پھر وہ ان قرآنی مصطلحات کے مفہوم کے تعین کے لئے کتبِ لغات کھول کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اس ورق گردانی کے نتیجے میں کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لے کر وہ نئے نئے معانی کا کنبہ جوڑا کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک یہ ساری کارروائی جس میں وہ عمر بھر قرآنی اصطلاحات کا مفہوم ازروئے کتبِ لغات متعین کرنے میں مبتلائے زحمت رہے،

---

⑭ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۶۶ء، ص ۶۰ — ⑮ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۶۱

⑯ طلوع اسلام، جون ۱۹۸۱ء، ص ۶۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ صرف یہ کہ پانی میں مدھانی چلانے کے مترادف ہے، بلکہ اگر یہ فریب دہی نہیں تو فریب خوردگی ضرور ہے۔

بہرحال اقامت الصلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ، انفاق اور جملہ دیگر اصطلاحات میں جو معانی و مفاہیم شارع علیہ السلام نے نظامِ اسلام کے ساتھ وابستہ کرتے ہوئے سمو دیے ہیں اور معاشیاتِ اسلام کے حوالہ سے جو لزومات و مضمرات ان میں ودیعت شدہ ہیں، ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کتب لغات کی بنیاد پر کھینچ تان کر کے مارکسزم کی فکری و ذہنی غلامی کے زیراثر، خودساختہ معانی داخل کرنا سخت بے جا بات ہے۔ 'مفکرِ قرآن' صاحب کی عمر بھر کی 'قرآنی خدمات' کا ماحصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی ایک ایک اصطلاح کو لے کر اشترا کی تہذیب کی فکری اسیری میں مبتلا ہو کر کتبِ لغات کی آڑ میں اس کے اندر نئے مدالیل و مفاہیم داخل کئے ہیں۔

❹ حقیقی ومجازی معانی کے اُصول وضوابط

اس میں شک نہیں کہ عربوں کے ہاں بعض الفاظ کے حقیقی اور مجازی معانی پائے جاتے تھے (اور اب بھی ہیں)۔ اہل زبان اُنہیں سمجھتے بھی تھے اور جناب مضمون نگار صاحب بھی اس کے قائل ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> ''حقیقت یہ ہے کہ کسی لفظ کے عرفی و حقیقی یا مجازی معانی لینے کے لئے بھی کچھ اُصول اور ضابطے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی کا جو دل چاہے اور جب اور جیسا چاہے وہ مجاز کا بہانہ بنا کر اصل مفہوم و مدلول الفاظ کا تیاپانچہ کردے۔''[17]

'مفکرِ قرآن' صاحب (اور ان کی تقلید میں وابستگانِ طلوع اسلام) کی یہ عام روش ہے کہ انہیں اگر کسی حقیقت کو تسلیم کرنا بھی پڑے تو بڑے مبہم انداز میں کرتے ہیں۔ ان حضرات کی تکنیک یہ ہے کہ کسی ایک جگہ بھی بات واضح اور متعین طور پر نہ کہی جائے، ہر بات کو مبہم رکھا جائے اور ہر جگہ متضاد بات کہی جائے تاکہ مداری کی پٹاری سے حسبِ منشا جب اور جہاں جی چاہے بات پیش کردی جائے۔ اعتراف واظہارِ حقیقت کی حد تک تو یہ بات درست اور بجا ہے کہ ''حقیقی یا مجازی معانی، مراد لینے کے بھی اُصول وضوابط ہیں''...... لیکن حرام ہے جو کبھی

---

[17] طلوع اسلام، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

'مفکر قرآن' نے (یا ان کے متبعین نے) کسی مقام پر ان اُصول وضوابط کا ذکر کیا ہو۔ ہم ان حضرات سے درخواست گزار ہیں کہ وہ ان اُصول وضوابط کی ضرور وضاحت فرمائیں جو اقتباسِ بالا میں مذکور ہیں، تاکہ دنیا خود دیکھ لے کہ خود 'مفکر قرآن' نے ان اصول وضوابط کو اپنی تحریروں میں کہاں تک مرعی 'ملحوظ رکھا ہے یا انہیں بالکل ہی نظر انداز کردیا ہے۔ اس درخواست کے بعد مندرجہ ذیل چند آیات کو ملاحظہ فرمائیے:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۝۱۸ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ۝۱۹ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝۲۰ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ۝۲۱ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۝۲۲﴾

آیات آپ نے ملاحظہ فرمالیں، اب ان کا معنی ومفہوم بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

"اور (صدائے غیبی نے پوچھا) اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا "یہ میری لاٹھی ہے، چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں، اسی سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑ لیتا ہوں، میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔" حکم ہوا: "اے موسیٰ! اسے ڈال دے۔" چنانچہ موسیٰ نے ڈال دیا اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔ حکم ہوا "اب اسے پکڑ لے، ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں۔" اور (نیز) حکم ہوا "اپنا ہاتھ، اپنے پہلو میں رکھ، اور پھر نکال، بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو، چمکتا ہوا نکلے گا۔ یہ (تیرے لئے) دوسری نشانی ہوئی۔"[۱۸] (طٰہٰ:۱۷تا۲۲)

قارئین کرام! یہاں یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ آیات کی یہ ترجمانی بھی پرویز صاحب ہی کے قلم سے برآمد ہوئی ہے۔ اور اب ان ہی آیات (جی ہاں، بالکل ان ہی آیات) کا مندرجہ ذیل مفہوم بھی ملاحظہ فرمالیجئے اور لطف یہ کہ یہ مفہوم بھی جناب پرویز صاحب ہی کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ از راہِ کرم ہر آیت کے مفہوم کا مطالعہ کرنے سے قبل ایک نظر متعلقہ آیت کے الفاظ پر بھی ڈال لیجئے۔ اب ملاحظہ فرمائیے، آیت ۱۷ کا مفہوم جس میں گنتی کے یہ چند الفاظ ہیں: ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى﴾

(۱۷) چنانچہ اس کے بعد موسیٰ کو اس انقلابی پروگرام کے سلسلہ میں ہدایات واحکام دیے

---

(۱۸) معارف القرآن، ج۳، ص۲۰۲ تا ۲۰۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے۔ ان میں فریق مخالف کو روشن دلائل و براہین سے قائل کرنے کی ہدایات بھی تھیں اور مقابلہ کے وقت، قوت اور سخت گیری سے کام لینے کے احکام بھی۔ جب یہ احکام دیے جاچکے (تو ندائے غیب نے کہا کہ) اے موسیٰ! تم ان احکام و ہدایات پر قوت اور برکت، ہر دو نقاطِ نگاہ سے غور کرو اور بتاؤ کہ تم اُنہیں کیسا پاتے ہو۔(۱۹)

اس کے بعد بقیہ آیات کا مفہوم بھی ملاحظہ فرما لیجئے، لیکن الفاظ آیات کو ذہن میں مستحضر رکھتے ہوئے:

(۱۸) موسیٰ نے کہا ''بارِالٰہا! یہ احکام کیا ہیں، میرے لئے تو سفر زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں۔ میں اب انہی کے آسرے سے چلوں گا، اور ہر مشکل مقام پر، اُنہیں مضبوطی سے تھامے رکھوں گا تاکہ میرا قدم کہیں نہ پھسلے۔ انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (یعنی بنی اسرائیل، جن کا گڈریا بنا کر تو مجھے بھیج رہا ہے) جھنجھوڑوں گا اور اس طرح ان کے جمود و تعطل کو مبدل بہ حرکت و عمل کروں گا۔ ان کے علاوہ زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق جو میرے سامنے آئیں گے، ان سے بصیرت و راہنمائی حاصل کروں گا۔

(۱۹) حکم ہوا کہ تم نے ٹھیک سمجھا، اب تم انہیں لوگوں کے سامنے پیش کردو۔

(۲۰) اس کے بعد جب موسیٰ نے اس مہم پر غور کیا جس کے لئے اسے مامور کیا جارہا تھا تو اسے اندازہ ہوا کہ ان احکام کا لوگوں کے سامنے پیش کرنا، آسان کام نہیں۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ ضابطہ احکام نہیں، ایک اژدھا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے۔

(۲۱) خدا نے موسیٰ کو اطمینان دلایا اور کہا کہ اس خیال سے مت گھبراؤ۔ ان احکام کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ ان کے متعلق جو بات تم نے کہی تھی (کہ ان سے فلاں فلاں منفعت بخش کام لوں گا) ہم انہیں ایسا ہی بنا دیں گے (یہ اژدہا کی طرح ہلاکت آفرین ثابت ہوں گے، باطل کے لئے لیکن تمہارے اور تمہاری قوم کے لئے سہارا بن جائیں گے۔

(۲۲) اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو، بلکہ نہایت اطمینان و سکون اور کامل دل جمعی سے اپنی دعوت کو واضح اور روشن دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو تمام مشکلات سے محفوظ و مصئون باہر نکل آئے گا۔ تیری یہ کامیابی، تیری دعوت کی دوسری نشانی ہوگی (پہلی نشانی، دشمن کی تباہی اور دوسری نشانی، تمہاری جماعت کا تمکن اور سرفرازی)(۲۰)

(۱۹) مفہوم القرآن، ج۲، ص۵۰۴ (۲۰) مفہوم القرآن، ج۲، ص۷۰۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیات کے فوراً بعد جو عبارت پرویز دی گئی ہے وہ 'ترجمہ آیات' ہے جبکہ یہ لمبی چوڑی عبارت 'مفہوم آیات' ہے۔ ترجمہ اور مفہوم میں کیا فرق ہے؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاید (پرویز صاحب کے نزدیک) جس عبارت میں الفاظِ آیات کے معنی و مفہوم کی کچھ رعایت ملحوظ رکھی جائے وہ 'ترجمہ' ہے، اور جس عبارت میں الفاظِ آیات کی لفظی پابندی سے بالاتر ہوکر الفاظ کا بے پناہ اُمنڈتا ہوا سیلاب آتا دکھائی دے تو وہ 'مفہوم آیات' ہے، جسے اگر جملہ آیاتِ قرآن کے حوالے سے یکجا کرکے کتابی شکل میں ڈھال دیا جائے تو پھر یہ کباڑ خانہ 'مفہوم القرآن' کہلاتا ہے اور یہ سب کچھ فہم قرآن کو آسان بنا دینے کے لئے محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات کے اُصول پر کیا گیا ہے جہاں تک محاورۂ عرب کا تعلق ہے، خود سوچ لیجئے کہ مذکورہ بالا آیات کا یہ مفہوم القرآن اگر دورِ نزول قرآن کا اَن پڑھ، جاہل، تمدن و حضریت سے یکسر عاری، سادہ مزاج بدو پڑھ لیتا، تو واقعی وہ قرآن کو اس قدر آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا جس قدر سہولت کے ساتھ وہ زمین، آسمان، پہاڑ، صحرا اور دشت و غار کا مفہوم سمجھے ہوئے تھا؟ اب رہا تصریفِ آیات کا اُصول تو بظاہر کس قدر خوش آئند ہے یہ نام اور عملاً خواہ یہ 'تحریفِ آیات' سے بھی آگے بڑھ کر تمسیخ آیات ہی کا روپ دھار لے۔

مجازی معنی اور باطنی معنی

اگر قارئین کرام میں سے کوئی صاحب سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۷ تا آیت نمبر ۲۲ کا وہ مفہوم جو قلم پرویز سے برآمد ہوا، لکھ کر طلوعِ اسلام کو بھیج دیں اور ساتھ یہ کہہ دیں کہ یہ ان آیات کا باطنی مفہوم ہے تو کیا آپ کو پتہ ہے کہ 'مفکر قرآن' صاحب یا طلوعِ اسلام کیا ردعمل ظاہر کرے گا؟ آپ کو علم ہو یا نہ ہو، لیکن ہمیں علم ہے کیونکہ 'مفکرِ قرآن' نے اپنی 'قرآنی بصیرت' کی بنا پر مرنے سے پہلے ہی ایسے معاملات میں اپنے ردعمل کا اظہار کردیا تھا۔ وہ فوراً ہی یہ کہہ دیں گے کہ

> "قرآن کی موجودگی میں، باطنی معنی اور مسلک کی تائید اور مدافعت وہ جذبات پرستی ہے جس سے قرآن نے اس شدت سے روکا تھا۔" (۶۱)

لیکن اگر اسی مفہوم آیات کو یہ کہہ کر 'مفکرِ قرآن' یا طلوعِ اسلام کو ارسال کردیں کہ یہ آیات

---

(۶۱) سلسبیل، ص ۱۵۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مجازی مفہوم ہے تو وہ أحسنت اور مرحبا کہہ کر اسے شاداں وفرحاں قبول کریں گے کیونکہ ان آیات کے اسی 'مجازی مفہوم' کے بارے میں وہ خود یہ فرما چکے ہیں کہ

"آیات نمبر ۱۷ تا ۲۲ میں الفاظ کے مجازی معانی لئے گئے ہیں۔"(۴۲)

قرآنی الفاظ کی لفظی پابندی سے آزاد ہوکر قلم سے اُگلے ہوئے خوبصورت الفاظ کے ڈھیر کو اگر مجازی معنی کہہ دیا جائے تو وہ قابل قبول ہو، لیکن اگر اسے باطنی معنی قرار دیا جائے تو ناقابل قبول ہو۔ آخر یہ کیوں؟ کسی عبارت کے باطنی معنی یا مجازی معنی ہونے کا معیار کیا ہے؟ وہ کون سے اُصول وضوابط ہیں جن کی بنا پر ① دونوں قسم کے معانی میں فرق و امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ اور ② مجازی معنی کو درست قرار دیا جاسکتا ہے؟

ہم جناب مضمون نگار سے بصد ادب و احترام مستفسر ہیں کہ مجازی مفہوم کے درست قرار پانے کے لئے جن اُصولوں وضوابط کا ذکر انہوں نے اپنے مقالہ میں فرمایا ہے، وہ آخر ہیں کیا؟ ہمیں اُمید ہے کہ وہ ان اصول وضوابط کو مع حوالہ جات کے ترتیب وار بیان کرکے "ہمارے لئے جودوکرم کا باب وا کرنے میں بخل وتساہل سے کام نہیں لیں گے" ورنہ لوگ یہ باور کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ 'مفکر ِقرآن' صاحب کا "جو دل چاہے، جب اور جیسا چاہے وہ مجاز کا بہانہ بنا کر اصل مفہوم و مدلول کا تیاپانچہ کرڈالتے تھے۔"

⑤ کیا علامہ اقبالؒ منکر حدیث تھے؟

جناب مضمون نگار صاحب، منکرین حدیث کے پراپیگنڈے کا شکار ہوکر یا خود اس پراپیگنڈے میں شامل ہوکر فرماتے ہیں کہ

"اگر انصاف پسندی کوئی اُصول ہے تو ہم ان ناقدانِ پرویز سے التماس کریں گے کہ یا تو وہ علامہ محمد اقبال کو بھی منکرین حدیث میں شمار کریں کیونکہ ان کے موقف ِحدیث اور علامہ پرویز کے موقف ِحدیث میں سرموفرق نہیں ہے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو کم از کم انہیں اپنے تضادِفکر ونظر پر کچھ تو ندامت محسوس کرنی چاہیے۔"(۴۳)

حقیقت یہ ہے کہ سچائی کی تو کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے، جس سے آگے کوئی راست باز شخص تجاوز نہیں کرسکتا لیکن جھوٹ کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوتی جہاں پہنچ کر کوئی کاذب ومفتری رک

(۴۲) مفہوم القرآن، ج۲ص ۱۰۶۷

(۴۳) طلوع اسلام، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۴۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے۔ منکرین حدیث کے چند نمایاں اکاذیب و اباطیل میں سے ایک واضح جھوٹ یہ ہے کہ علامہ اقبال منکرِ حدیث اور منکرِ سنت بھی تھے۔ اس جھوٹ کو اعادہ و تکرار کے ساتھ بکثرت اور بار بار دہرایا جاتا ہے، کیا آپ کو پتہ ہے کہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ

''نازیوں کے گوئبلز...... کا مقولہ تھا کہ جھوٹ کو اگر سو دفعہ دہرایا جائے تو وہ سچ بن جاتا ہے۔ دنیا اس کے اس مقولے پر ہنستی رہی، لیکن دور رس نگاہوں نے اسے قیمتی متاع سمجھ کر احتیاط سے رکھ لیا تاکہ بوقتِ ضرورت اس سے کام لیا جاسکے۔''(۴۳)

اب ظاہر ہے کہ منکرین حدیث سے بڑھ کر 'دور رس نگاہ' کس کی ہوگی؟ انہوں نے اسے قیمتی متاع سمجھ کر رکھ لیا اور بوقتِ ضرورت اس سے خوب کام لیا۔ علامہ اقبالؒ کے سلسلہ میں یہ پراپیگنڈا بھی بڑی 'دور رس نگاہ' کے ساتھ اس مقولے سے بھرپور کام لینے کی ایک کڑی ہے۔

یاد رکھئے، کسی شیطان نے آج تک اپنی شیطنت کو خود اپنے نام سے پیش نہیں کیا، بلکہ یہ کام اس نے ہمیشہ ان لوگوں کے نام کی آڑ میں کیا ہے، جن کا قوم میں احترام اور اثر و رسوخ پایا جاتا ہے۔ اگر شیطان اپنے باطل نظریات کو خود اپنے نام سے پیش کرے تو اسے خود بھی علم ہے کہ سماج میں یہ قابل قبول نہ ہوں گے۔ اس لئے باطل کو حق کا اور بگاڑ کو صلاح کا لباس زُور پہنا کر ان ہستیوں کے نام کی آڑ میں پیش کرتا ہے جو معاشرے میں مقامِ احترام و تعظیم رکھتے ہیں۔ اس قسم کے شیطنت مزاج اور حیلہ جُو لوگ ان ہستیوں کی بڑی مبالغہ آمیز مدحت و ثنا کے ساتھ ساتھ ان کی بڑی بڑی تصاویر اور پورٹریٹ کو اپنے آگے رکھتے ہیں اور خود ان کے پیچھے رہ کر ان کی آڑ میں اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی زبانوں پر اسلاف کے حق میں زندہ باد کے نعرے اور ان کے ہاتھوں میں ان واجب الاحترام ہستیوں کی تصویریں عامۃ الناس میں یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ انہیں ان ہستیوں سے بڑی عقیدت اور محبت ہے۔ اس کے بعد یہ پُرفریب لوگ جو چیز بھی ان اسلاف کی طرف منسوب کردیں، لوگ اسلاف کے ساتھ اپنے احترام و عقیدت کے بل بوتے پر بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے درست مان لیتے ہیں۔ ٹھیک یہی تکنیک ہے جو انکارِ حدیث کے علمبرداروں نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (وغیرہ) کے بارے میں اختیار کی ہے۔ مجلّہ طلوعِ اسلام کے ابتدائی دور میں اس کے پہلے صفحے پر حضرت

(۴۳) طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۶۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ محمد اقبال کی بڑی دلکش تصویر شائع ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد کلامِ اقبال میں سے کوئی ایک قطعہ پیش کیا جاتا تھا پھر علامہ اقبال کو مختلف مقالات و مضامین کے ذریعہ ان کی 'شاعری' پر دادی جاتی تھی تاکہ ان کے نام کی آڑ میں یہ دکانداری چلتی رہے اور نام اقبال کے باعث طلوعِ اسلام کے گاہکوں میں اضافہ ہوتا رہے اور آج تک درجہ بدرجہ اس تکنیک میں وقتی تقاضوں کے تحت کمی بیشی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے۔ اقبال سے متعلقہ مضامین و مقالات میں اس بات کا خاص التزام برتا جاتا ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ، علامہ اقبال کے شغف کو تو نمایاں کیا جائے، لیکن اس کی اطاعتِ سنتِ نبویہ کا کہیں ذکر نہ آنے پائے۔ شاعر مشرق کے وہ اشعار تو پیش کردیے جائیں جن میں قرآن کریم کو اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے مگر اُن اشعار سے پرہیز کیا جائے جن میں اُمتِ مسلمہ کے زوال کا انحطاط کا سبب ترکِ سنتِ نبویہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ''نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن'' کو تو خوب اُچھالا گیا مگر ''از حدود مصطفیٰ بیروں مرو'' کے بیان سے اس طرح پرہیز کیا گیا جس طرح شیطان نیکی سے پرہیز کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مخصوص انداز کے تعارفِ اقبال نے جسے طلوعِ اسلام نے اپنی منفرد ذہنی اُفتاد کے پیش نظر تسلسل اور تواتر کے ساتھ برسوں جاری، ایک مخصوص حلقے میں یہ تاثر پیدا کردیا کہ اقبال بھی گویا یکے از منکرین حدیث تھے، حالانکہ یہ تاثر از سرتا پا بے اصل و بے بنیاد اور خالص کذب و باطل ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے زیادہ نہیں تو صرف ایک کتاب کا مطالعہ ہی کافی ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام کی ان یادداشتوں اور گفتگوؤں پر مشتمل ہے جن میں حدیثِ رسولؐ، اتباعِ رسولؐ اور کتاب و سنت کے متعلق علامہ اقبال کے نظریات کی صراحت ہوجاتی ہے۔ اسے سید نذیر نیازی صاحب نے روزانہ کی ڈائری کی صورت میں مرتب کیا ہے اور یہ وہی سید نذیر نیازی صاحب ہیں جو پرویزی طلوعِ اسلام کے اجرا سے پہلے خود 'طلوعِ اسلام' ہی کے نام سے ایک مجلّہ نکالا کرتے تھے۔ ان کی کتاب 'اقبال کے حضور' اس اعتبار سے بھی ایک ثقہ کتاب ہے کہ سید نذیر نیازی صاحب ایک تو علامہ مرحوم کے بہت قریبی ساتھی تھے اور دوسرے خود طلوعِ اسلام سے وابستہ افراد بھی، انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب میں حدیثِ رسولؐ اور سنتِ نبیؐ سے متعلقہ فرموداتِ اقبال، ان کی زندگی کے بالکل آخری ایام سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلق رکھتے ہیں۔ ان فرمودات کے بعد یہ ناممکن ہے کہ انکارِ حدیث پر مبنی ان کا کوئی فرمان پیش کیا جاسکے۔

مقالے کی تنگدستی کے باعث میں نہ تو اس کتاب 'اقبال کے حضور' میں سے کچھ اقتباس پیش کرنے کی گنجائش پاتا ہوں اور نہ ہی کلامِ اقبال میں سے کچھ اشعار۔ میں صرف دو ایسے اقتباسات پیش کررہا ہوں جو مجلّہ طلوعِ اسلام ہی سے ماخوذ ہیں تاکہ اس موضوع پر خود وابستگانِ طلوعِ اسلام پر حجت قائم ہوسکے اور یہ اس لئے بھی کہ ع

• مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری!

طلوعِ اسلام کا مقصدِ اجرا

طلوعِ اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں اپنے مقصدِ اجرا کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا:

"پرچہ طلوعِ اسلام کے مقاصد کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ اس کا مسلک حضرت علامہ اقبالؒ کے نورِ بصیرت کو عام کرنا: یعنی مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ سے متعلق ہر مسئلہ کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں پیش کرنا ہوگا۔"[۴۵]

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ علامہ اقبال کا مسلک کتاب وسنت ہی تھا۔ ان کے نورِ بصیرت کو عام کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسائل حیات کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد ذہنِ پرویز نے عقائد ونظریات کے معاملے میں جو اُلٹی زقند لگائی اور قرآن وسنت کی بجائے فقط قرآن کی رٹ لگانا شروع کی تو مسلکِ اقبال کو بھی 'مفکر قرآن' نے اپنے بدلتے ہوئے عقائد کی بھینٹ چڑھا دیا اور یہ پراپیگنڈہ شروع کردیا کہ علامہ اقبال یکے از منکرین حدیث تھے۔ نیز اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جو شخص خود اپنے نظریات ومعتقدات کو بدل ڈالنے کے بعد دوسری قابل احترام ہستیوں پر بھی یہ جھوٹا الزام عائد کرتا ہے کہ ان کے عقائد بھی اس کے اپنے تبدیل شدہ عقائد کے مطابق تھے، وہ علامہ اقبال کے کلام کی تشریح وتوضیح کرے گا؟ یا ترمیم وتغییر؟

امر واقعہ یہ ہے کہ 'مفکرِ قرآن' صاحب علامہ اقبال کے نام کی آڑ میں اپنے افکارِ باطلہ کے کھوٹے سکوں کو اسی طرح سوقِ علم میں لایا کرتے تھے جس طرح یہود ونصاریٰ اور مشرکین

---

[۴۵] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، ص ۹۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مکہ، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر اپنے معتقداتِ باطلہ کو منڈی کا مال بنا کر پیش کیا کرتے تھے اور پھر قرآنِ کریم کو ان کی تردید میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ ﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (آلِ عمران:٦٧) آج ہم بھی یہ حقیقت واشگاف کرنے پر مجبور ہیں کہ علامہ اقبال کا مسلک، مسلکِ انکارِ حدیث ہرگز نہ تھا بلکہ قرآن وسنت ہی ان کا مسلک تھا اور یہ کشف حقیقت بھی ہم کسی اور ذریعہ سے نہیں بلکہ طلوعِ اسلام ہی کے ذریعہ کررہے ہیں۔☆

دوسرا حوالہ؛ مکتوبِ اقبال

اب دوسرا حوالہ ملاحظہ فرمائیے، یہ بھی طلوع اسلام ہی سے ماخوذ ہے۔ یہ دراصل علامہ اقبال کے اس خط کا اقتباس ہے جو آپ نے جامع ازہر (مصر) کے شیخ مصطفیٰ المراغی کی خدمت میں ارسال کیا تھا، تاکہ وہاں سے کسی قابل جہاں دیدہ علومِ قدیمہ وجدیدہ سے بہرہ مند جید عالم دین کو بلا کر دارالسلام کی سکیم کو بروئے کار لایا جائے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ 'دارالسلام' کے زیرعنوان جس مضمون میں سے علامہ اقبال کے خط کا یہ اقتباس پیش کیا جارہا ہے، وہ مضمون خود پرویز صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ لیجئے، ملاحظہ فرمائیے، اقتباس مکتوب اقبالؒ

> ''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں قائم نہیں کیا گیا۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ حضرات ایسے ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلامی کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیبِ حاضرہ کے شوروشغب سے دور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں جو کہ ان کے لئے ایک علمی اسلامی مرکز ہو اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی

☆ اقبالؒ کے نبی ﷺ کی ذات اور آپ کی احادیث کے بارے میں عقیدہ کے لئے درج ذیل کتب دیکھیں:

◉ محمد اسماعیل قریشی، ناموسِ رسولؐ اور قانون توہین رسالت ص ۴۰۷، الفیصل ناشران کتب لاہور، ۱۹۹۹ء

◉ مرزائیت کے متعلق جواہر لعل نہرو کے جواب میں علامہ اقبال کا بیان، شعبہ اشاعت وتبلیغ لاہور، ۱۹۳۶ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتب موجود ہوں۔ علاوہ ازیں ہم ایک ایسا رہنما جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو اور نیز انقلاباتِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی روح سے واقف کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید، یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے، تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کرسکیں۔"(۲۶)

مصر سے جب ایسی کوئی شخصیت میسر نہ ہوسکی تو ہندوستان ہی میں سے علامہ مرحوم کسی ایسے ہی جوہر قابل کے متلاشی رہے اور بالآخر ان کی نگاہ انتخاب سید ابوالاعلیٰ مودودی پر پڑی اور انہیں حیدر آباد دکن سے دارالسلام (جمال پور، پنجاب) میں منتقل ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ علامہ اقبال کی اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے دارالسلام میں تشریف لے آئے۔

مودودی صاحب ہی کیوں، پرویز کیوں نہیں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر علامہ اقبال مرحوم، منکر حدیث اور منکر سنت تھے اور پرویز صاحب کے ہم مسلک ہونے کی بنا پر صرف حجیتِ قرآن ہی کے قائل تھے تو انہوں نے دارالسلام میں اس دینی خدمت کے لئے پرویز صاحب کو کیوں نہ دعوت دی؟ اور اس مودودیؒ ہی کو کیوں دعوت دی، جن کا مسلک قرآن کی حجیت اور سنت کی سندیت و حجیت پر قائم تھا؟ جس پر ان کی کتاب 'سنت کی آئینی حیثیت' اور کئی دیگر تحریریں شاہدِ عدل ہیں۔

حیاتِ اقبال کے آخری لمحات

حدیثِ نبویؐ کے متعلق اقبال کا رویہ کیا تھا؟ اس کی وضاحت کے لئے اب میں حیاتِ اقبال کے بالکل آخری لمحات کو نذرِ قارئین کررہا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے کہ موت سے چند ثانئے قبل انہوں نے حدیثِ نبویؐ کے متعلق کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا:

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کی شب، بڑی قیامت خیز شب تھی۔ وہ مفکر اسلام جس نے اپنے نغموں سے مسلم معاشرے پر خودی کے راز کو آشکار کیا، جس نے رنگ و نسل، علاقائیت اور زبانوں کی عصبیت سے بلند ہوکر، ساری انسانیت کو سربلندی کا پیغام دیا، جس نے اپنے شعر و ادب سے

(۲۶) طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۹ء، ص ۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم اسلامی کو اتحاد کی راہ دکھائی، جس نے اپنی شاعری میں شرفِ انسانی کے رموز کو واضح کیا، جس نے اپنے کلام سے قومی تشخص کے اُمور کو ابھارا، جس نے اپنی فکر اور شاعری کو اتحاد اسلامی اور تحریک آزادی کو فروغ دینے کا ذریعہ بنایا۔ یہ دانائے راز، جاوید منزل کے ایک کمرے میں بستر مرگ پر اس وقت کا انتظار کررہا ہے جب بندہ اپنے محبوبِ حقیقی سے جاملتا ہے اور موت بندۂ مومن پر حیاتِ دوام کے دروازے کھول دیتی ہے۔

اس قیامت خیز شب میں تمام تیماردار، ساڑھے بارہ بجے شب کو رخصت ہوگئے، علامہ کو پچھلے پہر رات کو بے چینی شروع ہوئی۔ شب کے تین بجے علامہ نے راجہ حسن اختر کو بلایا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو علامہ نے اپنے ملازم دیوان علی سے فرمایا کہ تم سو جاؤ، البتہ علی بخش جاگتا رہے، کیونکہ اب اس کے سونے کا وقت نہیں۔ پھر راجہ حسن اختر سے فرمایا کہ پیٹھ کی طرف کیوں بیٹھے ہو؟ راجہ حسن اختر علامہ کے قریب ہو بیٹھے تو فرمایا: ''قرآن مجید کا کوئی حصہ سناؤ، کوئی حدیث یاد ہے؟ یہ فرما کر علامہ پر غنودگی طاری ہوگئی۔''[۱۷]

غور فرمایئے! وہ اقبالؒ جو آغوشِ موت میں بھی جاتے ہوئے یا تو قرآنِ کریم کی سماعت کا خواہش مند ہے یا حدیثِ رسولؐ کے سننے کا آرزو مند، وہ اپنی زندگی کا آخری عمل یا تو کتاب اللہ کی سماعت کو بنانا چاہتا ہے یا فرمانِ نبیؐ کی سماعت کو، کیا اس کے متعلق یہ گمان بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ احادیثِ نبویؐ کو سرچشمہ اسلام تسلیم نہ کرتا تھا؟ اقبال کی طرف انکارِ حدیث کے مسلک کو منسوب کرنا بالکل ایسا ہی ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہودیت، عیسائیت یا دین شرک کو منسوب کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ انکارِ حدیث کے مسلک کو اقبال کے کھاتے میں ڈالتے ہیں، وہ اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہیں کہ اس پر نہ تو وہ خالق ہی کی طرف سے کوئی حیا محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی مخلوق ہی سے شرم محسوس کرتے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جن لوگوں پر ان کے مسلسل اور پیہم بولے جانے والے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے، ان کی نگاہ میں ایسے لوگوں کی کیا عزت و آبرو باقی رہ جائے گی؟ آخرت کی جوابدہی کا احساس تو رہا ایک طرف، اگر یہ لوگ دنیا ہی میں اپنے جھوٹ کے انجام کا خیال کرلیں تو کبھی ایسی حرکت نہ کریں، لیکن کیا کیا

---

[۱۷] اقبال اور علماء پاک و ہند از اعجاز الحق قدوسی، ص۸۲ تا ۸۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے! جن لوگوں نے بس اس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہو اور کذب و زور ہی کی بنیاد پر لوگوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کا وطیرہ اپنا لیا ہو اور اپنی الزام تراشیوں، کذب بافیوں اور افترا پردازیوں ہی کے ذریعہ چند لوگوں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرڈالنے ہی کو کامیابی سمجھ رکھا ہو اور اپنی غلط بیانیوں کے باعث لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے ہی کو فوز وفلاح قرار دے رکھا ہو، انہیں اس سے کیا غرض کہ ان کی یہ بہتان تراشیاں اور افترا پردازیاں سنجیدہ طبقے میں ان کے متعلق کیا تاثر پیدا کررہی ہیں؟

آخر میں، میں یہ عرض کردینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ چند سطور صرف اس لئے لکھی ہیں کہ علامہ اقبال کی وفات کے بعد ان کی ذات کے احترام اور ان کے کلام کی تشریح کی آڑ میں 'طلوعِ اسلام' نے انہیں منکر حدیث قرار دے کر ان کی روح پر جو ظلم عظیم روا رکھا ہے، اس کا نہ صرف یہ کہ سدباب ہوجائے بلکہ علامہ اقبال کی نظر میں حدیث وسنت کا جو مقام ہے، وہ بھی واضح ہوجائے۔ ورنہ ہمارے نزدیک اقبال مرحوم کی ہرگز ہرگز یہ حیثیت نہیں ہے کہ انہوں نے اگر قرآن کے ساتھ حدیث کا نام لیا ہے تو ہم بھی ان کی اتباع وتقلید میں ایسا کر گزریں۔ ہم قرآن وسنت کو اسلام کا مستقل سرچشمہ تسلیم کرتے ہیں، ہم کتاب بلا پیغمبر اور قرآن بلا محمدؐ کے قائل نہیں ہیں۔ علامہ اقبالؒ اگر نہ بھی پیدا ہوتے، تب بھی اہل ایمان کے لئے ہدایت کا سرچشمہ قرآن وسنت ہی مانے جاتے، جیسا کہ ان کی ولادت سے قبل بھی ان کی حیثیت مسلم رہی ہے۔ قرآن وسنت کا یہ مقام دورِ نبویؐ سے اب تک تواتر وتسلسل کے ساتھ برقرار رہا ہے۔

یہاں تک تو 'اشراق' ۱۹۹۰ء کی تردید میں شائع ہونے والے مضمون میں طلوعِ اسلام کے بعض بے کار دعوؤں کی قلعی کھولی گئی ہے۔ آئندہ قسط میں طلوعِ اسلام کے اس مضمون پر نقد وتبصرہ کیا جائے گا جو مئی ۲۰۰۵ء میں محدث کی تردید میں شائع کیا گیا ہے۔

حسبِ روایت امسال بھی جامعہ لاہور الاسلامیہ میں جمعیت احیاء التراث الاسلامی، کویت کے تعاون سے علماو دعاۃ کی تربیتی ورکشاپ کا انعقاد (۲۳ تا ۲۷ جولائی ۲۰۰۵ء) ہو رہا ہے جس میں ملک بھر کے نامور اہل علم اہم موضوعات پر خطاب کریں گے۔ ان شاء اللہ

© rasailojaraid.com